اقبال کا خطبہ اول ''علم اور مذہبی تجربہ'' شروح کے آئینے میں

محمد خرم یاسین
M. Khuram Yasin
Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Dr. Allama M. Iqbal made a tremendous effort for the renaissance of religious thoughts of Muslims. He was worried about the decreasing and fading religious as well as moral values of Muslims. The reason behind was that not only in India but also all over the world, Muslims were being affected by the teaching, interpretations and industrial revolutions of the West. Therefore, to give them the new and better interpretation of Islam, he delivered his seven sermons which were later on printed under the title of "The Reconstruction of Religious Thought in Islam". This article throws light over sermons and also focuses on the explanatory studies of the first sermon "Knowledge and Religious Experience" through comparative analysis.

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا شعور جس دور میں پختگی کی جانب مائل ہوا اس وقت دنیا صنعتی انقلاب اور جنگِ عظیم اول و دوم کی ہولناکیوں سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب انسان کی منزلِ مقصود مادہ پرستی سے مشروط ہو چکی تھی اور اس کے لیے مذہب، تصوف یا روحانیات بیساکھیوں کی سی وقعت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جانب بڑھتی مشینی زندگی اور مادہ پرستی کا عفریت تیزی سے مذہبی و روحانی اقدر کو نگل جا رہا تھا تو دوسری جانب کارل مارکس اور لینن جیسے معاشی انقلابیوں کی کوششوں کے نتیجے میں دنیا نئے نظامِ حکومت سے روشناس ہو رہی تھی۔ ایسے دور میں مسلمان، جو اپنے مرکز و محور یعنی

اسلام سے بڑی حد تک دور تھے اور اپنی سینکڑوں سالوں کی نااہلیوں کی وجہ سے کہیں جسمانی اور کہیں ذہنی غلامی کا شکار ہو چکے تھے، ان کا یورپی تہذیب کی چکا چوند کے آگے اپنی بچی کھچی مذہبی و روحانی اقدار سے مزید دور ہو جانا اور اس کے سحر میں گرفتار ہو کر اس کی جانب کھنچے چلے جانے کے روشن ترین امکانات بھی موجود تھے۔ ایسے میں جب کہ وہ رائج علمِ کلام جو کئی صدیوں سے مسلمانوں کے سر کا تاج رہا تھا، عصری تقاضوں سے اس کی تطبیق یا مناسبت غیر مناسب ہو گئی تھی۔ دوسری جانب مغربی یلغار کے نتیجے میں عقلیت پرستی یا Rationalism کی روایت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی، اس لیے بھی اس بات کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب اسلام میں ایسے متکلمین و فلاسفہ ابھریں جو عہدِ حاضر کے مطابق ہی دین کے دائرے میں رہتے ہوئے مذہب کی نئی پرکھ، نئے تجربات، نئے امکانات اور نئے مسائل و سوالات کے جوابات دینے کے قابل ہوں۔ ایسے میں اقبال ایک مجتہد، فلاسفر اور متکلم کی صورت میں جلوہ گر ہوئے اور اسلام کی تفہیمِ نو کے حوالے سے اپنے افکار و خیالات سات انگریزی خطبات میں پیش کیے جو بعد ازاں کتابی صورت میں بعنوان ''The Reconstruction of Religious Thought in Islam'' شائع ہوئے۔

چونکہ اقبال کٹڑ قسم کے مولوی تھے اور نہ ہی شعر و فلسفہ ان کی دسترس سے باہر تھا، مزید یہ کہ ان کی مطالعے میں بہت وسعت تھی جس کا اندازہ ان کے خطبات میں بیان کیے گئے مشرق و مغرب کے فلاسفہ اور ان کے افکار و کتب وغیرہ کے ذکر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، اس لیے انھوں نے عصری تقاضوں کے مطابق ایمانیات کی تفہیم کی کوشش کی نہ کہ اپنے افکار کو دوسروں کے سروں پر تھوپنے کی۔ اس تفہیم کے ابلاغ کے لیے انھوں نے دو ذرائع استعمال کیے جن میں پہلا ذریعہ ان کی شاعری ہے جس کے مخاطب عام طور پر عوام الناس ہے جبکہ دوسرا ذریعہ مذکورہ خطبات ہیں جن کے مخاطب خواص ہیں۔ گو کہ شاعری میں بھی ان کے حکیمانہ و فلسفیانہ خیالات موجود ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ خطبات ہی ان کی فکر کا اصل نچوڑ ہیں۔ علامہ صاحب نے یہ خطبات مدراس، بنگلور، میسور، حیدر آباد دکن اور علی گڑھ میں سیٹھ جمال احمد کی دعوت پر پیش کیے۔ خطبات کے پس منظر کے حوالے سے فرزندِ اقبال ''خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کے موضوع پر اقبال نے اپنے خطبات مسلم ایسوسی ایشن مدراس کی دعوت پر جنوری ۱۹۲۹ء میں مدراس میں ارشاد فرمائے۔ یہ خطبات مدراس کے علاوہ حیدر آباد، دکن اور علی گڑھ میں بھی پڑھے گئے۔ دراصل اقبال نے ایک مقالہ اجتہاد پر تحریر کیا تھا جو ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو زیرِ صدارت شیخ عبدالقادر حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھا گیا۔ اس کی تفصیل اخباروں میں پڑھ کر مسلم ایسوسی ایشن مدراس کے روح رواں سیٹھ جمال احمد نے

انھیں مدراس آنے اور اسلام سے متعلق خطبات پڑھنے کی دعوت دی تھی۔''(۱)

ان خطبات کی اشاعت ۱۹۳۰ء میں ہوئی لیکن اس وقت ان خطبات کی تعداد چھ تھی۔ ۱۹۳۴ء میں اس میں ایک اور خطبے ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' کا اضافہ کر دیا گیا اور پھر سے اشاعت ہوئی جس کے بارے میں ان خطبات کے اولین ترجمہ نگار و شارح سید نذیر نیازی کہتے ہیں:

''۱۹۳۴ء میں بعض لفظی ترمیمات اور ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ جسے ارسٹوٹی لین سوسائٹی لندن Aristotelian Society, London کی دعوت پر لکھا گیا، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کے زیرِ اہتمام طبع ہوا۔''(۲)

چونکہ خطبات میں ایک اور خطبے کا اضافہ ہو چکا تھا اس لیے کتاب کے سرورق سے '' Six Lectures'' کے الفاظ حذف کر دیئے گئے۔ خطبات کے پس منظری مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبال کے کسی اچانک یا جذباتی خیال کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ان کی تیاری میں انھیں پانچ سال کا عرصہ لگا۔(۳) یہ پانچ سال ان کی سوچ بچار کے نتیجے میں جنم لینے والے نئے افکار کا نتیجہ ہو سکتے ہیں جبکہ حقیقتاً وہ اسلام کا مطالعہ بچپن ہی سے کر رہے تھے۔ البتہ کچھ لوگوں نے اقبال کے فہمِ اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ یہ اقبال کے محض دس سالہ اسلامی مطالعے کا نتیجہ تھے جب کہ ایسے کاموں کے لیے یہ عرصہ تھوڑا ہے، جب کہ اقبال کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک کا مطالعہ بچپن سے ہی ان کی عادات میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے والدِ محترم کی انھیں یہ نصیحت کہ قرآن اس طرح پڑھو جس طرح یہ نازل ہو رہا ہو، اس بات کی یقین دہانی کراتا ہے کہ وہ ایک دم سے تصوف کی جانب مائل نہیں ہوئے بلکہ اوائل عمری سے ہی اسلامی تعلیمات ان کے معمولات میں شامل رہی تھیں۔ پھر ان کی بیٹھک میں علمی و ادبی مجالس کا وہ سلسلہ جس کے منتظم ان کے والدِ محترم تھے اور محفلوں میں پائے کے علما، بزرگوار اور مشائخ ہوتے تھے، ان سب نے بھی انھیں ماورائیت اور مابعد الطبیعیات یا بالفاظِ دیگر تصوف کی جانب کھینچا۔ یہی وجہ ہے کہ سفرِ یورپ اور وہاں حصولِ علم کے دوران یورپی سائنسدانوں کے نظریات اور فلاسفہ کے فلسفے بھی ان کے ایمان کی بنیادیں ہلا نہ سکے۔ ڈاکٹریٹ کے لیے بھی ان کے مقالے کا انتخاب ماورائیت کے حوالے سے ہی تھا جس سے ان کے خطبات کے پس منظری مطالعے کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔ بہرحال ان کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جانب مغرب کی نئی تہذیب سے نالاں تھے تو دوسری جانب ان کی سامنے مسلمانوں کی روحانی اقدار کے ڈوبتے بیڑے کو بچانے کا عزم تھا، یہی اسباب خطبات کی تشکیل کا سبب بنے۔

ان خطبات کے مخاطب زیادہ تر نئی نسل کے وہ مسلمان تھے جو فکری اور کئی حوالوں سے جسمانی طور پر بھی مغرب کی غلامی قبول کر بیٹھے تھے یا پھر اپنی مسلسل مشکلات و شکست و ریخت کی بدولت یورپی آقاؤں کی تہذیب و تمدن کو ہی کامیابی کے لیے حرفِ آخر سمجھ بیٹھے تھے، اور اسی سبب اسلام

سے دور بھی ہو رہے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اسلام کی تعبیرِ نو کے لیے مسلمانوں کی نئی نسل کے سامنے مغرب ہی کے طرزِ تفکر و استدلال کو اپناتے ہوئے اس دور یا دورِ حاضر میں بھی اسلام کی قبولیت اور اہمیت کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ بھی نہیں کہ انھوں نے اسلام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی یا اس میں تحریفات یا ترمیمات کی کوشش کی ہو۔ چنانچہ اس سب کے درمیان خطبات کا اسلوب مشکل تر ہوتا گیا اور اسے سمجھنا عام انسان کے بس کی بات نہ رہا۔ مزید یہ کہ اس میں شامل ایک سو پچاس سے زائد فلسفیوں، سائنسدانوں اور صوفیوں وغیرہ کے نظریات اور ان پر بحث، عام انسان کے لیے ان کو اور زیادہ مشکل بنا دیتی ہے۔ سید نذیر نیازی کے بقول انھیں سمجھنے کے لیے اقبال چاہتے تھے کہ ان سارے فلسفیوں اور تحاریک کو بھی سمجھا جائے جن کا ان میں ذکر ہوا تھا۔ چونکہ خطبات کا اسلوب اس قدر آسان نہ تھا کہ علامہ صاحب کی باتیں با آسانی من وعن سمجھ آ جائیں اس لیے ان کی تفہیم کی کوششوں کا آغاز اقبال کی زندگی کے دوران میں ہی ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں اولین اور اہم ترین نام سید نذیر نیازی کا آتا ہے جنھوں نے علامہ صاحب کے ساتھ بہت سی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ان خطبات کے ترجمہ کو انھیں دکھایا بھی اور اس میں کچھ ترامیم بھی کروائیں۔ سید نذیر نیازی مرحوم نے خطبات کے ترجمے کو اہم وضاحتوں کے ساتھ ''تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے عنوان ترتیب دیا اور علامہ صاحب کی وفات کے بعد یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ یوں ان خطبات کی تفہیم کے سلسلے میں یہ پہلی کوشش ثابت ہوئی جس کی روایت علامہ کی زندگی میں ہی چل نکلی تھی۔

کتاب میں شامل خطبات جو دینِ حق کی ہمہ گیر تعمیر و تعبیرِ نو کے مترادف ہیں، ان کے موضوعات ''علم اور مذہبی تجربہ''، ''مذہبی تجربے کے انکشاف کی فلسفیانہ پرکھ''، ''خدا کا تصور اور عبادت کا مفہوم''، ''انسانی خودی، اسکی آزادی اور بقا''، ''مسلم ثقافت کی روح''، ''نظامِ اسلام میں حرکت کا اصول''، ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' چونکا دینے والے تھے اس لیے انھوں نے جلد ہی مبصرین و شارحین کی توجہ حاصل کر لی اور ان پر بحث کا آغاز ہو گیا، لیکن یہ سلسلہ جلد ہی جان توڑ گیا کہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ نتیجتاً لوگوں کی ساری توجہ اقبال کی شاعری کی جانب ہی مبذول ہو کر رہ گئی۔ جن لوگوں نے خطبات کی تفہیم کی کوشش کی ان میں الطاف احمد اعظمی جیسے لوگ بھی شامل ہوئے جن کی کوشش اقبال کے قد کو چھوٹا کرنے کی تھی اور وہ بھی جنھوں نے محض جزوی تفہیم کی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے خطبات کے تفہیمی کام کا جائزہ لیتے ہوئے تین نسلوں کے مبصرین کا ذکر کیا ہے۔ یہ تین نسلیں خطبات کو سمجھنے کے حوالے سے کسی حد تک کامیاب تو رہیں مگر ان کی مکمل تفہیم نہ ہو سکی، مزید یہ بھی کہ کبھی انھیں مسلکی افکار کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی گئی، کبھی مذہبی حوالے سے اور کبھی محض فلسفیانہ حوالے سے۔ ان سب حوالوں میں سے جہاں جس کسی شارح کے اپنے مسلک، مذہب یا وطنیت کے خلاف اسے کوئی بھی بات معلوم ہوئی، اس نے اس پر اعتراض کی صورت میں سوالات بھی اٹھائے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول

ابوالحسن ندوی جیسے عالم جنھوں نے اقبال کی شاعری پر تو ''شعرِ اقبال'' تخلیق کی لیکن ان کے خطبات کی اہمیت کے اس لیے منکر ہو گئے کہ وہ انھیں احترام و اتباعِ شریعت اور فکر و عمل کی یگانگت و ہم آہنگی میں حکیم سنائی، عطار اور عارف رومی وغیرہ سے کم تر سمجھتے تھے۔ مزید یہ کہ انھیں علامہ کی شخصیت میں ایسی نا معلوم خامیاں بھی نظر آتی رہیں جن کا بیان ان کی تحاریر میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ دوسری نسل کے مبصرین میں سے انھوں نے برہان احمد فاروقی کی رائے نقل کی ہے جس کے مطابق اقبال سائنٹفک علم اور مابعد الطبیعات کو مذہب سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہے۔ وہ اقبال پر خدا کے منکر ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ روحانی تجربہ اور وحی میں بھی تمیز نہ کر سکنے کے مرتکب ہوئے۔ فاروقی صاحب کے اعتراضات یقیناً جاندار ہو سکتے تھے بشرطیکہ ان کے پس منظر یا پیش منظر میں کوئی ایسی دلیل موجود ہوتی جو ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتی۔ اس کے برعکس خطبات میں علامہ صاحب کا کوئی ایسا کفریہ یا الحادی نظریہ نظر نہیں آتا۔ اعتراض برائے اعتراض کے تحت چلتے ہوئے وہ اس قابل نہ ہو سکے کہ اقبال کے نظریات کے بطلان کی صورت میں مستند حوالہ جات پیش کرتے، یا یہ بتا پاتے کہ عصرِ حاضر میں بھٹکتے ہوئے مسلمانوں اور یورپ کی تہذیبی و سائنسی ترقی کی یلغار کے نتیجے میں آج کے مسلمانوں کے سامنے مذہب کو کس طرح قابلِ قدر و عمل قرار دیا جائے؟ تیسری نسل کے مبصرین میں محمد الطاف احمد اعظمی جیسے لوگ سامنے آئے جن کا زور بھی اسی بات پر لگا رہا کہ کسی طرح اقبال کو ملحد و مجنوں ثابت کیا جا سکے۔ ان کے ہاں بھی اعتراض برائے اعتراض کا سلسلہ اپنے پس منظر اور حقیقت میں بے جان نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کے نظریات پر تنقید کرتے ہوئے اسلام کی تفہیم یا امتِ مسلمہ کے مسائل کا حل پیش کرنے سے مسلسل عاری رہتے ہیں اور ان کی سوچ ان الفاظ میں ڈھلتی ہے:

> ''اقبال کی نظر میں انسان اور خدا میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ایک ظاہر ہے اور دوسرا باطن۔ خدا کی تلاش انسان کی تلاش ہے اور انسان کی تلاش خدا کی تلاس کے ہم معنی ہے۔ اقبال اور شیخ محی الدین ابن عربی کے مذکورہ خیالات میں کامل یکسانیت ہے اور دونوں ہی خیالات کفر اور شرک کی گندگی سے آلودہ ہیں۔''(۴)

الطاف احمد اعظمی نے اقبال پر ایسے ہی اور بھی بہت سے الزامات لگائے ہیں جو ان کی دانست میں ان کے فلسفہ اسلام سے متصادم ہیں۔ خطبات کے شارحین محض ان پر اعتراضات داغنے والے ہی نہ تھے بلکہ پہلی نسل کے ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور خلیفہ عبدالحکیم، دوسری نسل کے سلیم احمد و دیگر اور تیسری نسل کے ڈاکٹر جاوید اقبال، سہیل عمر، پروفیسر عثمان اور ڈاکٹر محمد آصف اعوان ایسے شارحین بھی سامنے آئے جنھوں نے میانہ رو رہتے ہوئے خطباتِ اقبال کی تفہیم اور ان کے ابلاغ میں درپیش مسائل کے حل کے لیے اپنی توانائیاں صرف کیں۔ اس کے علاوہ سعید احمد اکبر آبادی، رفیع الدین ہاشمی، محمد منور،

ڈاکٹر ایوب صابر، ڈاکٹر غلام مصطفی خان اور ڈاکٹر طاہر حمید تنولی وغیرہ جیسے مفکرین و شارحینِ اقبال بھی سامنے آئے ہیں جنھوں نے اس راہ میں حائل دیگر اہم رکاوٹوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ ان سب کوششوں کے نتیجے میں خطباتِ اقبال کی تفہیم قدرے آسان ہوگئی اور اب قارئین بھی ذرا سی توجہ سے ان خطبات کی روح تک پہنچنے کی سعی کر سکتے ہیں جن کا مقصد بقول اقبال یہ ہے:

> ''پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیات اسلامیہ پر جمود کی ایک کیفیت طاری ہے۔ وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ تاریخ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالمِ اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں، کیوں کہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب در اصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہر آب و تاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہوجائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر، ضمیر اور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں۔''(۵)

جب کہ اس سے قبل علامہ مرحوم دیباچے میں یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ ان کی اس کوشش کو حتمی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے رہنے کی کوشش بھی جاری رکھی جائے۔ علامہ صاحب کی جدید فزکس اور اس کے نظریات کے حوالے سے مذہب کے پیچھے رہ جانے اور لوگوں کے اس سے دور ہوجانے کے خدشات عین درست تھے۔ ان کے خطبات کے اسباب بھی بالکل واضح تھے اور اس حوالے سے ان کی تشویش ان کی فکر بھی۔ اس سب کے باوجود انھوں نے اپنے فکر و فلسفے کو حتمی اور دائمی قرار دے کر پہلو تہی نہیں کی بلکہ ان خطبات کو اس راہ میں پہلا قطرہ قرار دے کر صلائے عام ہے یارانِ نقطہ داں کے مقولے پر عمل کیا۔

اقبال نے اپنے پہلے خطبے ''علم اور مذہبی مشاہدہ یا تجربہ'' کے حوالے سے جن مباحث کا آغاز کیا ہے ان میں علم کے ذرائع اور روحانی مشاہدات دو اہم ترین موضوعات ہیں۔ اس خطبے کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو اس میں انھوں نے انسانی دماغ میں آنے والے چند بنیادی سوالات اٹھائے ہیں اور پھر ایسے ہی سوالات کے جوابات کی تلاش میں فکر و فلسفہ اور مذہب کو بنیاد بناتے ہوئے ان کے ارتباط و اختلافات کی نشاندہی کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے جوابات مذہب اور وجدان دونوں سے ہی ممکن ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ بچہ آنکھ کھولتا ہے تو وہ ہر شے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کی نظر میں ہر شک ایک دلچسپی کا سامان بنتا ہے۔ شعور کی ذرا سی پختگی کو پہنچتے ہی وہ چاند کو اپنے ساتھ چلتا محسوس کرتا ہے، پھول پودے اسے اچھے لگتے ہیں اور یوں وہ مظاہرِ فطرت کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔ ان سے جس قدر اس کی قربت ہوتی چلی جاتی ہے، اس پر رازِ حیات منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی سبب کئی لوگ اللہ تعالیٰ کی

ذاتِ موجود کے بارے میں بھی سوالات اٹھانے لگتے ہیں۔ شعور کی بلوغت کو پہنچتے ہی انسان میں ویسے سوالات جنم لینے لگتے ہیں جیسے سوالات زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کے ذہن میں جنم لینے چاہییں۔ مثلاً یہ کہ یہ کائنات کیا ہے؟ فرد کی اس میں کیا حیثیت و مقام ہے؟ کیا وہ اس کا ایک جز ہے اور اگر ہے تو کل کیا ہے؟ ہم کسی خدا کو کیوں مانیں؟ کیا سینکڑوں، ہزاروں سالوں پرانا مذہب اور اس کے نظریات اس دور میں بھی قابلِ قبول ہیں یا پھر انسانی فکری ترقی ان نظریات سے آگے نکل کر ایسے مسلمہ اصول قائم کر چکی ہے جس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں؟ کیا حتمی سچائی کی تلاش میں خدا سے ہمکلام ہوا جا سکتا ہے یا اپنے معبود سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ یا پھر عبدیت کی معراج کیسے حاصل کی جائے؟ انسانی خودمختاری کیا ہے اور اس کا استعمال کیا ہے؟ اور اس جیسے دیگر بے شمار سوالات انسان کے خیالات کی آماجگاہ بنتے ہیں۔ بالخصوص ترقی یافتہ اور اپنے قوتِ بازو پر بھرپور انحصار کرنے والی قوموں کے ذہنوں میں یہ سوالات زیادہ شدت کے ساتھ گونجتے ہیں۔ ایسے میں جس نسبت سے قومیں ترقی کر رہی ہوتی ہیں، اس نسبت سے اگر مذہب ترقی نہیں کرتا یا دوسرے الفاظ میں علما و مشائخ جدید تقاضوں کے پیشِ نظر مذہب کی تفہیم و ترویج میں فیل ہو جاتے ہیں تو مذہب اور مادی ترقی (سائنس) میں پیدا ہونے والے اختلافات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ علامہ صاحب کے مطابق یہ ایک رائج خیالِ غلط ہے کہ سائنس اور مذہب کا یا مذہب کا عقلیت سے کوئی سروکار نہیں۔ حقیقتاً عہدِ گزشتہ میں مسلمان سائنسدانوں نے، جن کی آنکھیں اور دل مذہب کی روشنی سے منور تھے، انھوں نے ایسے گراں قدر کارنامے سرانجام دیے کہ آج جدید دنیا بالخصوص یورپ کی ترقی انھی کی مرہونِ منت دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب مسلمان بھی علم کے ساتھ ساتھ عمل پر کاربند رہے اور اسی لیے دنیا میں مقام و مرتبہ پایا۔

اسی فہمِ ذات و کائنات کے حوالے سے علامہ اقبال اپنے خطبہ اول میں ایسے بنیادی سوالات اٹھاتے ہیں کہ اس کائنات کی اہمیت، خوبیاں، مقصد اور ساخت کیا ہے جس میں ہمارا بسیرا ہے۔ کیا یہ ابدی ہے یا اس کی ساخت میں کوئی مستقل عنصر موجود ہے؟ ہمارا اس سے تعلق کیا ہے اور اس میں ہمارا حصہ و مقام کیا ہے؟ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟ اقبال کے بقول یہ سوالات مذہب، فلسفہ، شاعری میں عام ملتے ہیں جب کہ شاعری میں ان کی نوعیت ذرا ادنیٰ درجے کی ہو سکتی ہے، فلسفے میں اس سے بہتر اور مذہب میں بہترین۔ اب ان سوالات کے جوابات جاننے کے لیے بھی یہی تینوں ذرائع استعمال ہو سکتے ہیں۔ ہمیں بہت سے سوالات کے جوابات شاعری سے ملتے ہیں، بہت سے جوابات فلسفے سے اور بہت سے جوابات مذہب سے۔ حقیقتاً ان سب سوالات اور ان جیسے دیگر مابعد الطبیعیاتی سوالات کے جواب سائنس کے پاس موجود نہیں کہ یہ نہ تو فلسفہ ہے اور نہ ہی مذہب۔ البتہ سائنس سوائے مذہب کے، فلسفہ اور شاعری، دونوں کو متاثر کرنے کی بھرپور طاقت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی طریقۂ تحقیق میں تشکیک ہی اولین شے ہے جو بڑی خوبی سے کسی بھی نتیجے تک

پہنچانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اقبال کا استدلال یہ ہے کہ جہاں ان سوالات کے جوابات فلسفے اور شاعری سے کسی حد تک مل سکتے ہیں، وہیں ان کے جوابات بہترین انداز میں مذہب سے مل جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب اپنی ہر صورت میں قابلِ قبول ہے اور کیا یہ آفاقی ہے؟ اگر آفاقی ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تفہیم میں کسی قسم کا تغیر ہونا چاہیے یا نہیں۔ ان سوالات کے جواب اثبات میں ہی ہیں۔

علامہ صاحب نے علم کے ذرائع میں سے وجدان کو بہت اہمیت دی ہے کہ یہ سوچ اور تفکر کی پرواز کو بلند کرتا ہے اور اسے بہت دور لے جاتا ہے۔ انھوں نے وجدان کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ عقل بے سمت پرندہ ہے اور وجدان جب مذہب کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو یہ لاینحل معموں کو بڑی تیزی اور آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ وجدان سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ایک مذہبی تجربہ جس کے متحمل عام انسان، اولیاء اور صحابہ تک نہیں ہو سکتے بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص ترین بندوں کو منتخب کر کے نبوت عطا کرتا ہے، وحی ہے۔ وحی اور وجدان دو مختلف مابعد الطبیعیاتی مظاہر ہیں لیکن دونوں ہی کا تعلق مذہب اور روحانیات سے ہے۔ وحی کا ذریعہ علم ہونے پر کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں کہ اس کے ذریعے دنیا و آخرت کی وہ معلومات اور راہنمائی مہیا کی گئی ہے جو جدید دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ زیادہ واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس خطبے کی ابتداء ہی میں اقبال نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا فلسفہ جس کی بنیاد آزادانہ تحقیق پر ہے، اس کا اطلاق مذہب پر ہو سکتا ہے؟ اس کا اطلاق مذہب پر اس لیے ممکنات میں سے نہیں کہ یہ وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے جب کہ مذہب کوئی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونے والی شے نہیں۔ اس کے عقائد مسلم ہیں اور اس کا جوہر ایمان ہے جو کہ یقین کے ذریعے پیدا ہوتا ہے جب کہ فلسفہ تشکیک کے ذریعے عقلی بنیادوں پر اشیاء کے ردوقبول کو اپناتا ہے۔ یہاں انھوں نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مذہب کا عقل سے کوئی تعلق نہیں، یا اسے اس کے دائرے میں لا کر اس پر مزید بہتر انداز میں عمل پیرا ہونے یا اس کی تفہیم کی کوشش نہ کی جائے، البتہ اس پر خالص عقلی دلائل لانا درست نہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''مذہب فلسفہ کا کوئی شعبہ نہیں، کیوں کہ یہ محض فکر ہے، نہ احساس، نہ عمل، بلکہ انسان کی ذات کلی کا مظہر۔ لہٰذا فلسفہ مجبور ہے کہ مذہب کی قدر و قیمت کے باب میں اس کی مرکزی حیثیت کا اعتراف کرے۔ اسے ماننا پڑے گا کہ فکر انسان کا عمل ترکیب و ائتلاف مرتکز ہوتا ہے تو اس ایک نقطے پر۔''(۶)

وہ فکر و وجدان کا منبع ایک ہی قرار دیتے ہیں لیکن ان میں موجود فرق وہی ہے کہ وجدان کی رسائی اور پہنچ فکر سے بہت تیز اور درست ہے۔ پھر وہ فلسفہ یونان کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے مسلمان متکلمین کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے اس انداز میں اسلام کی وضاحت نہیں کی جس طرح سے ہونی چاہیے تھی جس کی

وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر فلسفہ یونان کی ہی پیروی کی۔ سقراط جیسے لوگ جو محض انسان کو ہی موضوعِ بحث مانتے تھے، اس کے فکری تلامذہ قرآنی تعلیمات کے وسیع دائرے سے اس لیے بھی دور رہ گئے کہ اس کا مخاطب توحشرات (شہد کی مکھی کی جانب وحی: وَاَوحٰی رَبُّکَ اِلَی (۷) اور مظاہرِ قدرت تک تھے (والصبح اذا تنفس۔ قسم ہے صبح کی جب وہ گہری سانس لے۔)(۸)

محض عقلیت پسندی اور عقلیت پسندی کی نفی، دونوں حوالوں سے علامہ اقبال کا نظریہ میانہ رو ہے اور وہ اس حوالے سے دونوں انتہا پسند ابنِ رشد اور غزالی کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ انھوں نے معتزلہ پر بھی یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ عقل وفہم سے دور کس طرح اسلام یا قرآن کی تفہیم کے حامی ہو سکتے ہیں۔ ویسے اسلامی عقائد کو از روئے عقل تسلیم کیا جا سکتا ہے جیسے زمین کا بننا، انسان کی پیدائش، سورج اور چاند کا نکلنا ڈوبنا، گائے کے پیٹ میں دودھ کا بننا، عقیدہ آخرت اور توحید وغیرہ کے بارے میں اسلامی وضاحت۔ لیکن فرشتوں اور جنت و دوزخ کا تصور چونکہ عقل سے بالاتر رہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ماڈرن دنیا اسے قبولیت کا درجہ اس وقت تک نہ دے جب تک کہ خود مذہب میں داخل نہیں ہو جاتی اور اس کی پیرو نہیں بن جاتی۔ یہاں پہنچ کر علامہ صاحب کانٹ کو تنقیدِ عقلِ محض کے سبب جرمنی کے لیے ایک تحفہ گردانتے ہیں کہ اس نے محض عقل پرستی سے نکال کر لوگوں کو دوبارہ سے روحانیات کی جانب گامزن کرنے کی کوشش کی جب کہ غزالی نے بھی عقل پرستی کے تحت اسلام کو جانچنے سے قطع تعلق کیا اور انھیں تصوف و وجدان کا راستہ دکھانے کی کوشش کی اس طرح انھیں بھی اسلام میں اہم مقام حاصل ہوا لیکن غزالی کا عقلیت سے مکمل منہ موڑ لینا اور تصوف وفکر کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کر دینا علامہ صاحب کو پسند نہیں۔ اس پر اعتراض کرتے ہوئے علامہ صاحب نے اس کی وجوہات بھی بیان کی ہیں:

> ''امام موصوف یہ نہیں سمجھے کہ فکر اور وجدان میں ایک نامی رشتہ کام کر رہا ہے۔ علیٰ ہذا یہ کہ فکر سے اگر متناہیت اور نارسائی کا اظہار ہوتا ہے اور ہم اسے بے نتیجہ ٹھہراتے تو اس لیے کہ فکر زمانِ متسلسل سے وابستہ ہے۔ بایں ہمہ یہ خیال کہ فکر بالطبع متناہی ہے اور اس لیے ممکن نہیں لامتناہی تک پہنچ سکے، اس فکر کو غلط نظریے پر مبنی ہے جو علم کے باب میں ہم نے فکر کے طریق ادراک کے متعلق قائم کر رکھا ہے اور جس کی وجہ ہے ہمارے منطقی فہم کی خامی۔''(۹)

علامہ صاحب غزالی کی طرح فکر کو نارسا اور بے نتیجہ نہیں مانتے بلکہ اسے متحرک مانتے ہیں۔ جو بھی چیز متحرک ہے اس کی کوئی نہ کوئی منزل ہے اور اگر منزل نہ بھی ملے تو اس میں ترقی کے امکانات بالکل واضح ہوتے ہیں۔ اس پر علامہ صاحب نے فکر کی متناہیت اور لامتناہیت پر بڑی خوبصورت بحث قائم کی ہے۔ کوئی بھی لامتناہیت متناہیت کے بنا ممکن نہیں۔ فکر چونکہ تحدید سے آزاد ہے اور اس پر پابندی ہرگز نہیں لگائی جا سکتی اس لیے اس کی اعلیٰ اقسام وجدان سے جا ملتی ہیں۔ گویا فکر جو صحیح سمت میں

ہو، بشکلِ وجدان اس حقیقی کل کا حصہ بھی بن سکتی ہے جو سب سے اعلیٰ وارفع ہے اور لوحِ محفظ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ حضرت عمرِ فاروق کا سینکڑوں میل دور اپنے سپہ سالار کو ''یا ساریہ الی الجبل'' کہنا اور اس کو یہ الفاظ سننا جیسے بہت سے مافوق الفطرت واقعات علامہ صاحب کے اس دعوے کو تقویت بخشتے ہیں۔ درج ذیل حدیثِ قدسی کو مدنظر رکھا جائے تو علامہ صاحب کی بات سمجھ آنے لگتی ہے۔

> ''اور میرا بندہ نفل عبادتیں کر کے مجھ سے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر تو یہ حال ہوتا ہے کہ میں ہی اس کا کان ہوتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہوتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ وہ اگر مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اس کو دیتا ہوں۔''(۱۰)

آئین اسٹائن کے نظریہ کائنات نے چونکہ طبیعیات کے حوالے سے دنیا میں بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا اور اس میدان کی قدیم روایات متزلزل ہو گئی تھیں اس لیے کائنات کے اسرار و رموز کو نئے انداز سے دیکھنے کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ کائنات کی نئی تعبیر و تشریح یقیناً عوام اور خواص سبھی کے لیے دلچسپی کا باعث تھی، اس حوالے سے علامہ صاحب قرآنِ مجید کا حقیقی مقصد انسان کے ذہن کو مابعد الطبیعیاتی معاملات میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے ایک برتر اور اعلیٰ شعور کی پرورش کی دعوت دیتے رہے۔ اس حوالے سے انھوں نے گوئٹے کا اسلام کے بارے میں یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں ہے اور ان کی اپنی تعلیمات ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی بھی شخص اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ درحقیقت ان سارے مباحث کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے نظر انداز کردہ خزینے کی جانب توجہ دلانا چاہتے تھے۔ کائنات کی تعبیر و تشریح اور اپنے موقف کی تائید میں انھوں نے قرآنِ مجید کی متعدد آیات کو بھی بطور حوالہ پیش کیا ہے جن میں دن اور رات کی تبدیلی میں، کائنات کے بنانے میں، اور اس میں سیر کر کے مشاہدات کرنے اور ایسے دیگر مظاہر کے بارے میں غور و فکر کی دعوت کے ساتھ ساتھ اس کو مسخر کرنے کی جانب توجہ بھی دلائی گئی ہے۔ علامہ صاحب کے نظریات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی جامدیت کے بھی خلاف تھے۔ اسی حوالے سے انھوں نے اپنی شاعری میں بھی کائنات کی ناتمامی اور مسلسل آنے والی صدائے کن فیکون کا ذکر کیا ہے۔ خطبہ اول میں ایک اور اہم مسئلہ کائنات میں انسان کی حیثیت کا ہے۔ کائنات میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اسے بہت سے اختیارات دیے ہیں جن سے یہ اپنا جہان خود پیدا کرنے کی طاقت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اسی لیے اسے چاہیے کہ ایسے اقدامات کرے جن کی بدولت کائنات کے سربستہ رازوں تک پہنچے اور اسے تسخیر کرنے میں آسانی ہو اور اگر اس میدان میں مشکلات درپیش ہوں تو اس صورت میں اپنی قوتِ ارادی کو بھی کام میں لانے کوشش کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ روحانی تنزلی اور غلامی جیسے مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

''لیکن اگر وہ پہل نہیں کرتا، اپنی ذات کی وسعتوں اور گوناگوں صلاحیتوں کو ترقی نہیں دیتا، زندگی کی بڑھتی ہوئی رو کا کوئی تقاضا اپنے اندرون ذات میں محسوس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی طرح سخت ہوجاتی اور وہ گر کر بے جان مادے کی سطح پر جا پہنچتا ہے۔ اس کی زندگی علیٰ ہذا پے بہ پے ترقی پذیر روح کے سفر کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس حقیقت سے رابطہ پیدا کرے جس نے اس کا ہر چہار طرف سے احاطہ کر رکھا ہے۔''(۱۱)

اب اس پہل میں چونکہ علم وفہم وفراست کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لیے اس میں تفکر اور مشاہدہ عمق پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ یعنی روحانی درجات کا سفر علم کی وجہ سے ہے، علم کا حصول حسیات کی وجہ سے اور عقل وفہم اس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ ایسی ہی انسانی کوششوں سے اس کی بصیرت تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان سب روحانی مراحل سے گزر کر انسان اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا قلب رواں ہوجاتا ہے اور اس میں انوارِ الٰہی کی تجلیات کا مشاہدہ ممکنات میں شامل ہوجاتا ہے۔ اسلام میں ایسے بے شمار بزرگ گزرے ہیں جن سے کرامات کا ظہور ہوا ہے اور انھوں نے انوارِ الٰہی سے فیضیابی بھی کی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کہتے تھے کہ دنیا میری ہتھیلی پر ایک رائی کے دانے کی طرح ہے، وہ ایک ہی وقت چالیس مریدوں کے گھر پر بھی موجود ملتے تھے۔ حضرت بایزید بسطامی، شیخ جنید بغدادی اور ایسے بہت سے بزرگانِ دین کی ذات سے بہت سی ایسی کرامات کا ظہور ہوتا رہا ہے جو یقیناً قربِ الٰہی کے حصول کے بعد ہی ممکن ہوسکتا تھا۔ علامہ صاحب نے خطبہ اول کے آخری چند صفحات صوفیانہ مشاہدات کے سلسلے میں اس کے طریقہ کار اور مسائل سے بحث کرتے ہوئے اس کا اختتام کیا ہے۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے مطابق ان خطبات کو سمجھنے یا ان کی تفہیم کرنے والوں کے تین دور گزرے ہیں۔ جہاں ان کے حق میں طاقتور آوازیں ابھریں وہیں ان پر سوالات بھی اٹھے، اعتراضات بھی ہوئے اور فتوے بھی لگے۔ لیکن اقبال کے پیشِ نظر جو مقصد تھا وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ان خطبات کی شروح کا ذکر کیا جائے تو سب سے پہلے سید نذیر نیازی کا خطبات اقبال کا ترجمہ مع تصریحات ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' موجود ہے۔ یہ کوشش چونکہ اقبال کی زندگی میں ہی ہوچکی تھی اور اس حوالے سے سید نذیر نیازی نے علامہ سے بہت سی ملاقات بھی کی تھیں اور ترجمہ ان کی نظروں سے گزرا تھا اس لیے یہ اس سلسلے میں پہلی اہم پیش رفت ثابت ہوئی۔ سید نذیر نیازی خود فلسفے کے استاد تھے اس لیے ان کے لیے ان خطبات میں دلچسپی فطری تھی۔ مزید یہ کہ وہ علامہ کے متعقد مین میں سے تھے اس لیے بھی وہ اس کام کے لیے راضی ہوئے تھے۔ خطبات پر

بات کرنے سے قبل سید صاحب نے اٹھائیس صفحات پر مشتمل مقدمہ پیش کیا ہے۔ اس مقدمے کے بنا خطبات کا مطالعہ یقیناً زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوسکتا۔ مزید یہ کہ اس مقدمے سے دیگر محققین و شارحینِ اقبال نے بھی مدد اور رہنمائی لی ہے۔ مقدمے میں سید نذیر نیازی نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ چونکہ ترجمے میں مصطلحات کے مسائل اہمیت کے حامل تھے اور بہت سے اصطلاحات ایسی تھیں جو اردو میں موجود ہی نہیں تھیں اس لیے انھیں علیحدہ سے تصریحات لکھنا پڑی۔ تصریحات کے بعد سولہ صفحات پر مشتمل مصطلحات موجود ہیں اور اس کے بعد چار صفحات کا اشاریہ۔ یہ ترجمہ اپنے دور کے مطابق تو اس قدر مشکل معلوم نہیں ہوتا تھا، دوسرا یہ کہ فلسفہ اور اسلامیات سے تعلق رکھنے والے قارئین کے لیے بھی یہ ترجمہ سودمند ثابت ہوتا رہا ہوگا لیکن عصرِ حاضر میں اس کے دقیق زبان اور مشکل اسلوب اور فلسفے کے ترجمے کے لیے فلسفہ ہی کی زبان کا استعمال اسے قدرے مشکل بنا دیتا ہے۔ مقدمے میں سید صاحب نے انگریزی عنوان کے اردو ترجمے کے بارے میں اہم وضاحتیں کی ہیں جس سے ان کی عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقدمے سے ایک پیراگراف ملاحظہ کیجیے جس سے زبان و بیان کی پیچ بندیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

> ''اگر فکر نارسا ہے اور وجدان ناقابل اعتبار ہے۔ اگر علم کا تعلق صرف مدرکات حواس سے ہے اور عمل محض انضباط ذات کا ایک ذریعہ، اگر یہ سب اپنے اپنے رنگ میں حقیقت کے ترجمان ہیں اور اس لیے ایک ہی راستے پر گامزن، یا سب نہیں، صرف ایک موثر ہے، باقی الاصل، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس مسئلے یا مسائل کا فیصلہ جو اس طرح پیدا ہو جاتے ہیں کس طرح کریں؟''(۱۲)

بہرحال خطبات کی تفہیم کے حوالے سے اس ترجمے کو اولین اہم ترین پیش رفت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں خطبہ اول کی شرح کی بات کی جائے تو چونکہ یہ ترجمہ ہی ہے اور کتاب کے آخر میں تصریحات بھی شرح کی شرائط پوری نہیں کرسکتیں اس لیے خطبے کی مکمل تفہیم کے حوالے سے اس کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔

فرزندِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے خطبات کی شرح کے حوالے سے ''خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم'' لکھ کر طالبانِ اقبالیات کے لیے بڑی آسانی پیدا کی اور تمام خطبات کو موضوع وار دو سو چودہ صفحات پر پھیلا یا دیا۔ ان کا یہ کام یقیناً خطبات کی تشریح کے حوالے سے حوالے کا کام ہے۔ انھوں نے اپنے سے قبل شارحینِ خطبات و ناقدینِ اقبال کے کام کا بڑی محنت سے مطالعہ کیا اور بیس صفحاتی مقدمے میں پس منظری مطالعے کے طور پر خطبات کی تحسین و تردید پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اپنے کام کو تحقیقی بنانے کے لیے انھوں نے مقدمے تک میں حوالہ جات پیش کیے ہیں تاکہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ مقدمے ہی میں انھوں نے خطبات پر ہونے والے کام کے تین ادوار یا تین نسلوں کے کام کا

بغور جائزہ لیا ہے اور اس حوالے سے محض مسلمان یا مشرقی ناقدین کا کام ہی نہیں بلکہ مغرب کے ڈبلیو سی اسمتھ اور ایچ۔اے۔آر۔گب جیسے ناقدینِ اقبال کے نقد کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔اس مقدمے میں اگر یہ کہا جائے کہ تفہیمِ خطبات کے پس منظری مطالعہ کو زیرِ غور لایا گیا اور بطور ملخص پیش کیا گیا ہے تو بھی غلط نہیں۔

خطبات کی شرح کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے اہم نکات کو ہی زیرِ غور رکھا اور ان کا انداز وضاحتی رہا ہے۔ ہر خطبے پر ہونے والے اعتراضات کا انھوں نے بھرپور جواب دینے کی کوشش کی ہے اور ان جوابات کی نوعیت کہیں ذاتی ہے اور کہیں شارحینِ اقبال کی کتب کی حوالہ جاتی۔ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش کو خطباتِ اقبال کا وضاحتی مطالعہ کہا جانا چاہیے۔شرح کے حوالے سے اسلوب عام فہم اور سادہ ہے جب کہ وضاحت کرتے ہوئے جہاں ضروت پڑی، دلائل بھی دیے ہیں۔مثلاً کائنات کی تخلیق کے بارے میں انھوں نے قرآن اور حدیث کے حوالے سے مختصر اور طویل تیرہ دلائل کا سلسلہ روا رکھا ہے۔جس سے قبل لکھتے ہیں:

> ''اقبال اب اپنے سوال کو دہراتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک جس جہان میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ جہان کسی تخلیقی کھیل کے نتیجے میں وجود میں نہیں لایا گیا۔ اپنے سوال کے جواب میں جو اصول انھوں نے قرآنی آیات کے حوالوں سے مرتب کیے ہیں، وہ مختصراً مندرجہ ذیل ہیں''(۱۳)

یعنی اقبال کے خیال کی وضاحت کے لیے ان ہی کے نکات اکٹھے کر دیے ہیں لیکن ان میں اپنے نقطہ نظر کا دخول نسبتاً کم کیا ہے۔مثلاً یہ کہتے ہوئے کہ مذہبی تجربے کی خصوصیات کے ضمن میں اقبال اپنے خیالات یوں پیش کرتے ہیں؛ پانچ نکات پیش کیے۔اس کے بعد جگہ جگہ پر اقبال ہی کی باتیں ذرا سی وضاحت کے ساتھ یا من وعن نقل کر دی گئی ہیں۔مثلاً ص ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ اقبال سگمنڈ فرائڈ جیسے ماہرین نفسیات کے اس نظریہ کو رد کرتے ہیں کہ مذہب محض افسانہ ہے۔البتہ انھوں نے ہر اہم نکتہ کے حوالے سے خطبہ پر ہونے والے اعتراض کو بھی سامنے رکھا ہے اور اس کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس میں سید نذیر نیازی، برہان احمد فاروقی اور الطاف احمد اعظمی جیسے ناقدین کے خطبات پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے تاکہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔اس سلسلے پہلے خطے میں چودہ صفحات پر اعتراضات کے مدلل جوابات دیے گئے ہیں۔چونکہ خطبات کی تشریح میں ڈاکٹر صاحب نے وضاحتی اور دفاعی طریقہ کار اختیار کیا ہے اس لیے اگر غور کیا جائے تو گیارہ صفحات پر اہم نکات کی وضاحت ہے اور اگلے چودہ صفحات محض اعتراضات کے حوالے سے موقوف ہیں جب کہ آخر میں اقبال کی زندگی کے ما بعد الطبیعاتی و ماورائی واقعات کا بیان ہے جس کے بعد چھتیس ۳۶ حوالہ جات بھی شامل کیے گئے

ہیں۔اس خطبے کی شرح کا آغاز انھی فلسفیانہ مسائل علم، حواس، معرفت اور سائنس سے کیا ہے جو خطبات میں پیش ہوئے۔اس میں مذہب اور عقل کے رشتے پر زیادہ طویل بحث کی گئی ہے جس کے بعد جہاں جہاں کسی مبصر یا شارح کا کا کوئی اعتراض یا تحسین ضروری سمجھی، وہ بھی دی گئی ہے۔اس شرح کو تفہیمِ خطبات کے سلسلے میں اہم سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

خطباتِ اقبال کے حوالے سے ایک اور اہم کام الطاف احمد اعظمی نے کیا ہے۔ان کا کام اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے خطبات پر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اعتراضات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔کتاب میں ساتوں خطبات سے بحث کی گئی ہے۔آغاز ہی میں اعظمی صاحب کی اقبال فہمی کی جہت ان کے ان خیالات سے واضح ہوجاتی:

> ''اقبال اور شیخ محی الدین ابن عربی کے مذکورہ خیالات میں کامل یکسانیت ہے اور دونوں ہی خیالات کفر وشرک کی گندگی سے آلودہ ہیں۔اللہ تعالیٰ اقبال کی مغفرت کرے۔خطبات میں کثرت سے ایسے خیالات ہیں جن پر واضح طور پر کفر وشرک کا اطلاق ہوتا ہے۔''(۱۴)

اسی کتاب کے پندرھویں صفحے پر اعتراض در اعتراض کا سلسلہ پہلی سطر سے ہی شروع ہوجاتا ہے جس میں لکھتے ہیں ''اقبال یہ بات بھول گئے کہ انسانی فکر برابر بدلتی رہتی ہے۔۔۔اس متغیر فکر کی روشنی میں اسلامی عقائد کی جو تاویل وتشریح کی جائے گی وہ یقیناً دیرپا ثابت نہ ہوگی''، ''اسلامی تعلیمات کا ماخذ کسی انسان کا ذہن نہیں ہے بلکہ اس کا مصدر و ماخذ ذاتِ مطلق یعنی اللہ تعالیٰ ہے''، اقبال کے مطالعہ کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی عقائد بالخصوص ذاتِ باری تعالیٰ کے ادراک کا معتبر ذریعہ روحانی وجدان یعنی مذہبی تجربے کو قرار دیا ہے۔اقبال کے مطالعے کی تیسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے قرآنِ مجید کی آیات سے استدلال کرتے وقت ان کے سیاق و سباق کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔''اعظمی صاحب کے اعتراضات اگر جاندار ہوتے تو یقیناً یہ مطالعہ اقبال میں کئی نئی جہات کا اضافہ کرتے۔ان کے اعتراضات کا نہ کوئی پس منظر ہے اور نہ ہی وہ جدید دنیا اور مسلمانوں کے مسائل کے حوالے سے کوئی حل پیش کرنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔البتہ ان کے اعتراضات کے نتیجے میں خطبات کے مطالعے میں بڑی اہم پیش رفت ہوتی رہی ہے اور اس حوالے سے بڑے مدلل جوابات بھی پیش کیے گئے ہیں۔یعنی اس کتاب کی اہمیت اس کے رد کے طور پر خطبات کی شروح پر ہونے والا کام ہے۔

خطبات پر اعتراضات کے جوابات کے حوالے سے جو کتاب سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور درحقیقت خطبات کی شرح ہی ہے، وہ سعید احمد اکبرآبادی کی ''خطباتِ اقبال پر ایک نظر'' ہے۔اس شرح میں انھوں نے علامہ اقبال کے خطبات میں بیان ہونے والے مذہبی فلسفوں کا ذکر کیا ہے اور ان پر لگنے والے الزامات کو بھی دلائل کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔کتاب کے عنوان

کے مطابق اس کے تین ابواب میں پہلا باب میں خطبات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے، دوسرے باب میں اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور تیسرے باب میں اجتہاد کے بارے اقبال کے نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ جس طرح سے خطبات پر اعتراضات سے قبل فکرِ اقبال کے ماخذ اور مسائل پر بات کی گئی ہے اس سے سعید احمد کی اقبال سے دلچسپی اور عقیدت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً انھوں نے کتاب کے آغاز میں ہی اقبال کے علم الکلام کی امتیازی خصوصیات اس طرح سے بیان کی ہیں:

> ''انھوں نے مشرق و مغرب کے قدیم و جدید مسلم اور غیر مسلم حکما، فلاسفہ، صوفیا، ماہرینِ نفسیات اور علمائے سائنس کے افکار کو نظریات کو کھنگھالا، تنقیدی اور تجزیاتی شعور و ادراک کی روشنی میں ان کے صحت و سقم کو جانچا اور پرکھا اور پھر خذ ما صفا دع ما کدر کے مطابق ان کے عطر سے اپنے مذہبی فکر کا خاکہ مرتب کر کے قرآن و حدیث، اقوال و اعمال صحابہ، اور اکابر صوفیائے اسلام کے تجربات و مشاہدات سے اس کے لیے سند تصدیق و توثیق حاصل کی، اس بنا پر اس جدید علم کلام میں زیادہ پختگی، گیرائی اور گہرائی ہے اور وہ جدید انسان کی زبان اور اس کے طریق فہم سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔'' (۱۵)

ویسے علی عباس جلال پوری نے بھی اقبال کو متکلم ہی بیان کیا ہے اور اس حوالے سے بہت سے دلائل بھی دیے ہیں۔ سعید احمد کی یہ کوشش اس حوالے سے بڑی کارگر ہے کہ انھوں نے فکرِ اقبال پر اعتراضات کے سلسلے کو جوابی صورت دے کر بہت کم کر دیا ہے اور مزید یہ کہ اس حوالے سے ذہن میں آنے والے سوالات کو بھی رفع کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

محمد عبدالسلام خاں نے بھی خطباتِ اقبال کے حوالے سے اپنی کتاب ''افکارِ اقبال'' میں ان کے نظریات کو سادگی سے بیان کر کے اس میدان میں اہم کام کیا ہے۔ وہ اقبال کے خیالات کو تبصرے کے انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور اس میں اپنے خیالات کا دخول بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اس حوالے سے مختلف چھوٹے چھوٹے پیراگرافس کی صورت میں سرخیوں کے ساتھ افکارِ اقبال پر بات کرنے کی کوشش کی ہے جن میں ''علم کے متعلق اقبال کی فکر''، ''مذہب کا نقد''، ''مذہب کی عقلی تشریح یا کلام''، ''اسلامی کلام اور فکرِ اقبال''، ''اقبال کے فلسفے یا کلام کی نوعیت''، ''فلسفے کے لیے معیارِ نقد''، ''فلسفے اور مذہب کا فرق''، ''علم اور وجود''، ''فلسفہ اعلیٰ''، وغیرہ شامل ہیں۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ان خطبوں میں تقریباً سب ہی بنیادی اسلامی عقائد آ گئے ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ، وحی و رسالت، جبر و اختیار، تقدیر، لوحِ محفوظ، حیات بعد الموت، برزخ، جنت و جہنم اور نامہ اعمال وغیرہ سب کی اپنی مابعد الطبیعیاتی موقف سے تشریح ہے۔'' (۱۶)

عصرِ حاضر میں تفہیمِ خطبات کے حوالے سے ایک اہم کام پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر کا بھی ہے۔ انھوں نے بھی سعید احمد اکبر آبادی اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی طرز پر خطبات کے حوالے سے اعتراضات کا مدلل جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب ''اقبال کے فہمِ اسلام پر اعتراضات۔ ایک مطالعہ'' میں انھوں نے فہمِ اقبال کی تفہیم کے لیے چار سو اکاون صفحات کو ''خطبات پر اعتراضات''، ''تصورِ اجتہاد پر اعتراضات''، جمہوریت کے ضمن میں اعتراضات''، ''غیر اسلامی عقائد و رجحانات کا الزام'' اور ''معرکہ اسرارِ خودی'' کے تحت تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ بھی تفہیمِ فکرِ اقبال اور بالخصوص خطباتِ اقبال کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ خطبات کے حوالے سے لوگوں نے اقبال کو کفر کی حدود چھلانگنے والا کہہ کر ان کی اس احسن کاوش کو برباد کرنے کی کوشش کی بھرپور کوشش کی تھی اس لیے ایوب صابر نے ''کیا اقبال نے مغربی فکر و فلسفہ پر انحصار کیا؟ کیا اقبال نے قرآنی آیات کی غلط تاویل کی؟ جیسے عنوانات کے تحت ان کے فکر و فہم کے حق میں دلائل پیش کیے ہیں۔ خطبات پر باقاعدہ بحث سے قبل انھوں نے ان کے فکری منہاج کے حوالے سے آٹھ صفحات مقرر کرتے ہوئے خطبہ اول کو چھیڑا ہے۔ اس میں انھوں نے علم، وحی، عقل، وجدان، قدیم و جدید علوم، ثبات و تغیرِ حیات جیسے موضوعات کے تحت اس بحث کو طول دیا ہے۔ وہ اعتراضات کے جواب کی صورت میں پہلے وضاحت کرتے گئے ہیں اور پھر اعتراضات کو رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جہاں انھیں ضروری لگا انھوں نے خطبات میں اشعار کا دخول بھی کیا ہے اور تصریحات بھی۔ اس کے علاوہ شارحینِ خطبات کے فہم پر بھی تنقید موجود ہے۔ مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی کے اقبال کے حوالے سے طبِ یونان کے ایک بیان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر وحید عشرت نے مغرب کے اس تہذیبی پہلو کی برتری کا اعتراف کیا ہے، اگرچہ کچھ غلط بیانی یہاں بھی کی ہے۔۔۔۔ وحید عشرت کا یہ اقتباس علامہ اقبال کے موقف کے اعتبار سے لایعنی ہے۔''(۱۷)

اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کئی جگہوں پر ایوب صابر اقبال سے دلی وابستگی کے باعث جذباتی بھی دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں جارحیت کے پہلو کا شائبہ ہوتا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اقبالیات کے حوالے سے معتبر حوالہ ہیں، انھوں نے بھی خطباتِ اقبال کی شرح کی جو کوشش کی ہے وہ اس حوالے سے قابلِ قدر ہے کہ کم وقت میں قاری خطبات کے بنیادی مباحث سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب علامہ صاحب کے خطبات کی تلخیص ہے اس لیے اس میں کسی بھی اسلامی تصور کی کوئی خاص وضاحت نہیں دی گئی، نہ ہی خطبات پر اعتراضات کا جواب ہے اور نہ ہی اس میں خلیفہ صاحب نے اپنی جانب سے کچھ خاص اضافہ کیا ہے۔ یہ تلخیص اسباق یا لیکچرز کے انداز میں ہے جس میں خلیفہ صاحب ایک خطبے کو بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور اقبال کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے اس کا اختتام کر دیتے ہیں۔ حقیقتاً خلیفہ صاحب کی یہ کاوش نہ تو ترجمہ ہے اور نہ ہی

تشریح۔ یہ ان دونوں کے بیچ کی وضاحت اور تلخیص ہے۔ اسلوب سادہ اور پرکشش ہے اور بیانیہ بھی سادگی ہی کا نمونہ ہے۔ خطبہ اول کی شرح کے حوالے سے وہ خطبہ اقبال ہی کو دوبارہ سے بیان کرتے ہیں اور علم، فلسفہ، وجدان کے موضوعات و مشکل تصورات کو آسان الفاظ میں اس طرح سے گوندھتے جاتے ہیں کہ قارئین کے لیے آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ''فکر بھی کوئی ساکن چیز نہیں اس کے اندر حرکت ہے۔ فکر کے اندر بھی اسی طرح لامتناہی مضمر ہے جس طرح بیج کے اندر پورا درخت مکنون ہوتا ہے۔ فکر کے اندر بھی ایک باطنی کلیت ہے مرورِ زمان میں بتدریج ظاہر ہوتی ہے۔ ادراک اور احساس کا کوئی جز، کل سے بے تعلق ہو کر پوری طرح قابلِ فہم نہیں ہو سکتا۔'' (۱۸)

خطبات کی تفہیم کے سلسلے میں ایک کام محمد شریف بقا نے ''موضوعاتِ خطباتِ اقبال (ترتیب وار بلحاظِ حروفِ تہجی)'' لکھ کر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے خطبات کے پچپن موضوعات کو بیان کیا ہے جن میں ''اجتہاد، اسلام، اشاعرہ، انسان، باطن، بقا، تاریخ، تصوف، تقدیر، توحید، عقل و خرد، فلسفہ، فکر اور وجدان، سائنس اور مذہب، فراریت، علم، عقل و خرد، نفسیات، وحی، الہام، یورپ اور یورپی فلسفہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ قارئین کی سہولت کی خاطر انھوں نے موضوعات کی سرخی کے نیچے جن جن خطبات میں یہ شامل رہے ہیں، بیان کر دیا ہے۔ مثلاً تصوف کی سرخی کے تحت، وہ تمام خطبات میں جہاں جہاں استعمال ہوا ہے، اس کو حوالوں سمیت پیش کر دیا گیا ہے۔ یوں موضوعاتی اشاریہ ترتیب پایا ہے اور شارحین و قارئینِ خطبات کے لیے یہ آسانی پیدا ہو گئی ہے کہ ایک موضوع کو علامہ صاحب نے جتنی بھی جگہ اور جس بھی انداز میں بیان کیا ہے وہ ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ خطبات کی تفہیم کے سلسلے میں یہ بھی ایک اہم کاوش ہے۔ ایک ایسا ہی مگر کچھ مختلف نوعیت کا کام ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی ''متعلقاتِ خطباتِ اقبال'' لکھ کر کیا تھا۔ ان کی اس کتاب میں مختلف ماہرین و شارحینِ اقبالیات کے مقالوں کو اکٹھا کیا گیا ہے اور ان کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان مقالات میں کوشش کی گئی ہے کہ خطبات کے موضوعات کو سمیٹ لیا جائے۔ یہ مقالات ڈاکٹر سید عبداللہ ہی کی کوشش پر ایک اجلاس میں پڑھے گئے تھے۔ اس حوالے سے معلومات مہیا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''موجودہ کتابچے کی تاریخ یہ ہے کہ میں نے ۲ دسمبر ۱۹۷۴ء کو اپنی اسی آرزو کی طرف توجہ دلانے کے لیے، اہلِ علم کے ایک مقتدر گروہ کو اپنے مکان پر جمع کیا، اس اجلاس میں جو ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمن باوصافہ کے زیرِ صدارت منعقد ہوا، حضرت علامہ کے عقیدت مند بتعداد کثیر شامل ہوئے۔ اور میری درخواست پر چند ماہرینِ اقبالیات نے مذکورہ بالا مقصد کے تحت چند مقالات پڑھے جنھیں اب کتابی شکل میں متعلقاتِ خطبات اقبال کے نام سے پیش کیا

جارہا ہے۔''(۱۹)

ان مقالات کا براہِ راست تعلق خطبات ہی سے ہے۔ مثلاً پہلا مقالہ عبدالحفیظ کا ردار کا ''اقبال اور دینی تجربہ'' کے موضوع پر ہے۔ اس لیے اس کے مباحث خطبہ اول و دوئم کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہی نوعیت دیگر خطبات کی ہے۔ یوں ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس احسن سعی کو شرح و تفہیمِ خطبات کے حوالے سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی سلسلے کے دیگر شارحین و مبصرین اور ان کی کتب کا ذکر کیا جائے تو پروفیسر محمد عثمان کی ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو''، محمد سہیل عمر کی ''خطباتِ اقبال۔ نئے تناظر میں''، وحید الدین کی ''فلسفہ اقبال۔ خطبات کی روشنی میں''، علی عباس جلال پوری کی ''اقبال کا علم الکلام''، میکش اکبر آبادی کی ''نقدِ اقبال''، اور پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالمجید کی ''اقبال اور جدید سائنسی نظریات'' اہم ہیں۔ عہدِ حاضر میں محمد سہیل عمر نے خطبات پر اہم سوالات اٹھائے ہیں اور ان کے حوالے سے ان کی پیش کردہ تفہیم بھی قابلِ تحسین ہے۔

تفہیمِ خطباتِ اقبال کے حوالے سے ابھی تک جو کام ہوا ہے وہ خطبات کے موضوعات، ان پر اعتراضات، اعتراضات کے جوابات اور ان کے تراجم کے ساتھ تصریحات کے حوالے سے ہوا ہے۔ بالخصوص ''شروح'' کو مدِ نظر رکھ کر کیا جانے والا کام ڈاکٹر محمد آصف اعوان کی پیش کش ہے۔ یہ شروح اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہیں کہ پہلی بار ان میں اقبال کے علمِ کلام، موضوعات، مباحث اور اعتراضات وغیرہ کو الگ الگ کتابی صورت دینے کے بجائے، ہر خطبے کی ایک مکمل اور الگ شرح لکھی گئی ہے۔ اس ضمن میں ان کی شروح میں ''اقبال کا پہلا خطبہ: علم اور مذہبی تجربہ (تحقیقی و توضیحی مطالعہ)''، ''اقبال کا دوسرا خطبہ: مذہبی تجربے کے انکشافات کی فلسفیانہ پرکھ (تحقیقی و توضیحی مطالعہ)''، ''اقبال کا تیسرا خطبہ: تصورِ خدا اور عبادت کا مفہوم (تحقیقی و توضیحی مطالعہ)'' اور خطبات پر دیگر شارحین کی طرح اجمالی جائزے اور تعارف کے حوالے سے ''معارفِ خطباتِ اقبال'' منظرِ عام پر آئی ہیں۔ مذکورہ بالا تمام کتب اپنی جگہ مکمل اور بہترین نظر آتی ہیں کہ ان میں ایک خطبے کی شرح کو ساری کتاب پر محیط کیا گیا ہے۔ درحقیقت ان دقیق و عمیق خطبات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان کی شروح کو الگ الگ کتابی صورت دی جائے۔ ان شروح میں ڈاکٹر صاحب کا انداز استدلالی اور وضاحتی رہا ہے۔ وہ اقبال کے ایک خیال سے بحث کرتے ہیں جس سے قاری کے ذہن میں سوالات جنم لینے لگتے ہیں لیکن اگلی چند سطور میں ان سوالات کے جوابات بھی موجود ہوتے ہیں اور وضاحت کے لیے قرآنِ پاک، سائنس، فلسفہ اور روزمرہ زندگی سے امثال اور اقبال و دیگر شعرا کے اشعار بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس سے ان خطبات کے تفہیم آسان تر ہوجاتی ہے۔ مثلاً خطبہ اول کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فلسفہ کو اختیار ہے کہ مذہب کو موضوع بنائے اور عقلی معیار کی کسوٹی پر پرکھے لیکن یہ بھی مذہب کی اجازت سے مشروط ہے یعنی یہ مذہب کے اختیارات میں سے ہے کہ وہ فلسفے کو اپنی پرکھ کے لیے کتنے اختیارات دیتا ہے۔ یعنی اگر کوئی مذہبی حکم یا

عبادت وغیرہ فلسفے کی رو سے درست نہیں تو فلسفے کو اختیار نہیں کہ اس کے خلاف علم بغاوت اٹھالے۔ یہ سطور پڑھتے ہوئے قاری کے دماغ میں فلسفے اور مذہب سے متعلق مباحث جنم لینے لگتے ہیں اور وہ ان دونوں کے معیارات اور حقائق کو پرکھنے کی جستجو میں ہوتا ہے کہ اگلی سطور اس کی اس مشکل کو حل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''فلسفہ کسی بھی عہد میں ذہنی ارتقا کے کسی ایک مرحلے کی انسانی عقلی کاوش کا نام ہے۔ جس میں اکملیت ہونا ضروری نہیں۔ کسی ایک دور میں جو مذہبی مسائل اور معاملات انسانی عقل کے لیے غیر مدرک اور نا قابلِ فہم ہوتے ہیں اگلے کسی دور میں ذہنی ارتقا کی بدولت مدرک اور قابلِ فہم بھی بن سکتے ہیں۔ گویا ایک عہد کے فلسفیانہ افکار دوسرے کسی عہد میں فکر و نظر اور عقل و دانش میں تغیر کے ساتھ ردو بدل کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی عہد کے فلسفیانہ افکار کو ایسی مطلق حقیقت کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی کہ انھیں بلا خوفِ تردید مذہبی عقائد کے ردوقبولیت کا حتمی معیار قرار دیا جا سکے۔''(۲۰)

ڈاکٹر آصف اعوان کی شروح کی یہ کاوش تا حال بہترین نتائج کی حامل ہے بہرحال شروح پر ابھی ماہرینِ اقبالیات مختلف حوالوں اور پہلوؤں سے روشنی ڈال رہے ہیں اور ان میں موجود جواہر و گواہر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قارئین تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھی اسباب کی وجہ سے دورِ حاضر میں خطبات کی تفہیم نسبتاً آسان ہوگئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ئ، ص:۵

۲۔ نذیر نیازی، سید، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء، ص:۷

۳۔ محمد شعیب، آفریدی، خطباتِ اقبال کی اردو تسہیلی کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ: ایم فل، مخزونہ شعبہ اقبالیات، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء، ص:۱۳

۴۔ الطاف احمد، اعظمی، خطباتِ اقبال ایک مطالعہ، لاہور: دار التذکیر، ۲۰۰۵، ص:۱۲

۵۔ نذیر نیازی، سید، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء، ص:۴۳

۶۔ ایضاً، ص:۳۸

۷۔ القرآن، النحل:۶۸۔۶۹

۸۔ القرآن، تکویر:۱۸

۹۔ نذیر نیازی، سید، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، ص:۴۲

۱۰۔ البخاریؒ، فی کتاب الرقاق، باب: التواضع، رقم: ۲۰۵۶

۱۱۔ نذیر نیازی، سید، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء، ص: ۴۹

۱۲۔ ایضاً، دیباچہ

۱۳۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ئ، ص: ۳۵

۱۴۔ الطاف احمد، اعظمی، خطباتِ اقبال ایک مطالعہ، لاہور: دار التذکیر، ۲۰۰۵، ص: ۱۳

۱۵۔ سعید احمد، اکبر آبادی، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۳ئ، ص: ۱۲

۱۶۔ محمد عبدالسلام خاں، افکارِ اقبال، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ ۲۰۱۱ئ، ص: ۱۲۴

۱۷۔ ایوب صابر، ڈاکٹر، اقبال کے فہمِ اسلام پر اعتراضات، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۶ئ، ص: ۲۵

۱۸۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، تلخیص خطباتِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، جون ۱۹۸۸ئ، ص ۱۴

۱۹۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، متعلقاتِ خطباتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ئ، دیباچہ

۲۰۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، علم اور مذہبی تجربہ تحقیقی و توضیحی مطالعہ، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۸ئ، ص: ۱۲

☆------☆------☆